

Liberal Journal of Language & Literature Review

Print ISSN: 3006-5887

Online ISSN: 3006-5895

<https://llrjournal.com/index.php/11>

ناول "راکھ" میں عصری شعور

Contemporary consciousness in the novel "Rakh"



Dr Aqsa Naseem Sindhu¹, Dr. Saima Iqbal^{*2}

*¹Assistant Professor, Urdu Department Government
Sadiq College Women University Bahawalpur*

*^{*2}Assistant Professor, Urdu Department Government
College University Faisalabad*

*^{*2}drsaimaiqbal@gcuf.edu.pk*

Abstract

In the novel "Rakh" written by Mustansar Hussain Tararr, contemporary consciousness emerges as a very important artistic and intellectual element. The novel reflects the political, social, cultural and psychological problems of its time and presents the collective history and social changes of Pakistan in an artistic manner. The division of the subcontinent, national and political changes and social chaos are presented in the novel in such a way that the past and the present seem interconnected. The author tries to understand the current social situation through historical events. The characters of the novel appear to be wandering in search of their individual and collective identity. The identity crisis caused by migration, cultural change and changing social conditions is an important symptom of contemporary consciousness. In "Rakh" a deep look is given at the struggle for power, political uncertainty, social inequality and national issues. The novel creates a critical awareness of the problems of its time and invites the reader to reflect on the situation. The loneliness, uncertainty and internal conflict of modern man are the main themes of the novel. The characters seem to be searching for their existence and purpose in a changing social environment. The novel presents wars and their effects not only as historical events but also as human tragedies. Thus, the novel evokes the consciousness of peace, humanity and human values. Mustansir Hussain Tarar's novel "Rakh" is an important representative novel of contemporary consciousness. It presents the issues of history, politics, society, human psychology and national identity in such a way that the reader can better understand the complexities and challenges of his era. This contemporary awareness gives this novel a unique place in Urdu literature.

Key Words: Mustansar Hussain Tararr, "Rakh", contemporary consciousness, issues of history, politics, society, human psychology, national identity, complexities & challenges of his era.

مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول "راکھ" کے آغاز میں سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۱۸ کا ترجمہ درج کیا ہے کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ کی سی ہے۔ جس پر آندھی والے دن زور کی ہوا چلے اور وہ اپنے اعمال سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے یہی تو پرلے درجے کی گمراہی ہے۔ یہ ناول ہماری پچاس سالہ قومی تاریخ کا آئینہ دار ہے جس کی ہر سطر ہمارے عروج و زوال کو ظاہر کرتی ہے اور اس میں سیاست دانوں کی حربہ سازیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ کس طرح عوام جن نمائندوں کو اپنے مسائل کے حل کے لیے اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں وہ عوامی فلاح کے بجائے اپنی اخلاقی پستی میں اضافہ کرتے ہیں۔ مصنف نے سیاست دانوں، جرنیلوں کی عسکری طاقت اور بیوروکریٹس کی نجی زندگی کی عمدہ تصویر کشی کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ عسکری حلقے بنیادی طور پر محب وطن ہیں جو ملک کی ترقی اور قومی دولت کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس ملک کے مکروہ سیاستدان ان کو غلط استعمال کرتے ہیں۔ مصنف خود جہاں گرد ہیں اس لیے ان کے وسیع مشاہدے نے اشرافیہ کے شفاف کپڑوں کے پیچھے چھپی اس آلودگی کو بے نقاب کیا ہے جو عام طور پر نظر نہیں آتی۔ چنانچہ "راکھ" اس زوال کی علامت ہے جو پاکستانی قوم کی رگ رگ میں زہر کی طرح اتر رہا ہے "راکھ" میں شرمندگی ہے۔

اس ناول میں یہاں کے رہنے والوں کی زندگیوں کو انتہائی مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے پس منظر میں کوئی پرانا یا فرضی زمانہ کارفرما نہیں ہے بلکہ یہ ہماری اپنی پچاس سالہ زندہ تاریخ کا عکاس ہے۔ ناول کا اصل موضوع ہماری وہ حقیقی زندگی ہے جس میں دکھ، سکھ، کامیابی، خوشی اور ناکامی کے تمام رنگ واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں ملک کی تقسیم اور اس کے بعد مچی لوٹ مار کے نتیجے میں اعلیٰ عہدوں تک رسائی حاصل کرنے والے اس مخصوص طبقے کی کھوکھلی زندگی کی بھی بہترین منظر کشی کی گئی ہے، جو خود کو اونچے طبقوں میں شمار کرنے لگا تھا۔ مزید برآں، ناول میں لاہور، کراچی، اسلام آباد اور ان کے مضافات میں رہنے والے مختلف طبقوں کے لوگوں کی میں پاکستان کی پچاس سالہ زندگی " معاشرتی زندگی اور ان کے مسائل کو بھی بھرپور انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔" راکھ کے سیاسی اتار چڑھاؤ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی نظام کے ڈھانچے کی شکست و ریخت ہے فوزیہ چوہدری اپنے ایک مضمون " راکھ کی کرید " میں لکھتی ہیں،

"...موضوعاتی اعتبار سے ناول کے اجتماعی ڈھانچے پر بھلے ہی مصنف کی گرفت مضبوط رہے یا نہ رہے وہ اپنی خوبصورت نثر کے جال سے قاری کو آزاد نہیں ہونے دیتا، پھر قاری اس خوبصورت نظر کو زمین منا کر تمام مشکل مقامات سے دھیرے دھیرے گزر جاتا ہے اور ادب عالیہ کا مزہ لیتا ہے۔ ۱

مستنصر حسین تارڑ نے "راکھ" کی ابتدا اس طرح کی ہے۔
"چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں۔ ان میں ایک شکار ہے، قادر آباد کے آس پاس۔ اور وادی سوات کا ایک سیلتی منظر ہے۔۔۔ اور کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے۔
۲۔ اور چوک چکلہ ہے۔"

مستنصر حسین تارڑ کے اس ناول میں مشاہد، برگپٹا، زاہد کالیہ، مردان، شوبہا، فاطمہ اور بابو کے کردار خاصے جاندار اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ "راکھ" کے مجموعی منظر نامے میں کامران کی بارہ دری، چوک چکلہ، دریائے راوی اور راکھ" کا فکری و زمانی کینوس "لکشمی بلڈنگ (منشن) جیسے تاریخی مقامات کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہیں۔ مصنف کے شاہکار ناول "بھاؤ" کے برعکس ماقبل تاریخ (قدیم عہد) کا نہیں، بلکہ ہمارا موجودہ اور معاصر زمانہ ہے۔ اور موجودہ دور کی لفظی تصویر کشی کرنا بذات خود ایک خاصا مشکل اور چیلنجنگ کام ہے۔ اس پچاس سالہ وسیع تر تاریخی پس منظر میں کامونکی ریلوے اسٹیشن پر آ کر رکنے والی ریل گاڑی اور اس سے اٹھنے والی دھوئیں کی ہوک، لوہاری چوک، انارکلی، چوک چکلہ، لال حویلی اور اس کے روشن دانوں سے اندر آتی ہوئی روشنی، اور مینار پاکستان کے پاس امڈتا ہوا عوامی ہجوم— یہ سب کچھ ہماری اجتماعی زندگی کے حقیقی عکاس کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ الغرض، "راکھ" میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ہم روزمرہ زندگی میں اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ اسی حقیقت پسندی کا اعتراف کرتے ہوئے فوزیہ چوہدری رقم طراز ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ کا ناول " راکھ " محض راکھ کا ڈھیر " نہیں بلکہ اس میں زندگی کی ایسی چنگاریاں بھی جلتی بھتی نظر آتی ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی کی اونچ نیچ کا احاطہ کرتی ہوئی غیرت و حمیت کو ہو ادبیتی ہیں اور اپنی حرارت سے زندگی کو جلا بخشتی ہیں۔" ۳

"راکھ" کا منظر نامہ قادر آباد میں مرغالی کے شکار سے ہوتا ہوا بیٹ خیلہ اور وادی سوات میں جانتا ہے۔ مصنف ایک مصور کی طرح الفاظ کے رنگ و روغن سے ان مناظر میں جان ڈالتے ہیں کہ وہ مناظر سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں۔

"درخت کسی ایک قسم کے نہیں تھے۔ وہ اونچے، پستہ قدر پھیلے ہوئے منحنی اور سیدھے، گھنے یا چھدرے تھے۔ لیکن سب کے سب پرانے تھے۔ ایک جھنڈ تھا جس میں جامن، بھیرے، کچنار، شیشم دھریک اور املتاس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے تھے، صرف پرندوں کو ان کی پہچان تھی۔ دو سب ان کے اند میرے میں رہتے تھے اور باہر سے دکھائی نہیں دیتے تھے، دھواں چڑیاں بہت تھیں ہد ہد ابھی تھے اور کو میں بھی ایسی تھی کہ وہ نظر بہت کم آتی تھیں۔ تیز دھوپوں والی جون کی دو پہروں میں املتاس کی پیا ایٹ کا انبار سب سے الگ ہو جاتا۔ اس کے زرد کچھے چینی لالٹینوں کی طرح ہو اسے بھولتے رہتے۔۔۔ انہی درختوں میں سات کروں والی کوشی واقع تھی۔۔۔ اسے سات کروں والی کو بھی اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کے۔۔۔ سات کمرے تھے۔ اور ان میں سے ایک طویل کرہ دالان کے ساتھ چلا گیا تھا اور اس دالان سے جن درختوں کے منے نظر آتے تھے ان پر اب بھی دھوپ ذرا کم تھی۔۔۔ دسمبر میں دھوپ ان کی چوٹیوں پر اترتی اور اترتے اترتے رک جاتی اور پھر وہی سے رخصت ہو جاتی طویل کرو ان دونوں کا تھا۔" ۴

مستنصر حسین تارڑ نے معاشرتی زندگی کو اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر بہت باریک بینی سے حقیقی رنگ دیا ہے۔ ان کے پلاٹ میں کہانی کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ منظم ہیں۔ اس سے انہوں نے ایک مضبوط ڈھانچہ تیار کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اپنی تحریر کے ذریعے ہمارے سامنے کر دیا ہے تاکہ ہم بھی اپنی

آنکھوں سے اس کو اسی طرح محسوس کریں۔

"راکھ" کا لوکیل موجودہ زمانہ ہے۔ اس کا تاریخی عرصہ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۹۲ء تک ہے آپ کے فراہم کردہ غیر کی جگہ "لکشمی منیشن"، "لاشوں کی سزاند" کی جگہ "ترتیب یافتہ اور اسکیننگ کی غلطیوں (جیسے "کاشمی منیشن" "لاشوں کی سزاند"، اور بابر کی مسجد کی مسماری کے حوالے سے بگڑے ہوئے جملوں) سے بھرپور مسودے کو ادبی، تنقیدی اور تحقیقی معیار کے مطابق درست کر کے ایک مربوط اور رواں پیراگراف کی صورت میں یوں لکھا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں لکشمی منیشن، کامران کی بارہ دری اور اس سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی، چوک چکلہ اور سوات کی وادی کا سلیٹی منظر نامہ کہانی میں حقیقی رنگ بھرتے ہیں۔ ناول کے پس منظر میں دراصل ہماری معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کی پچاس سالہ تاریخ سانس لے رہی ہے۔ مصنف نے روایتی ابواب بندی کے بجائے وقت کو ایک دائرے (گول چکر) میں گھما کر ۵۸۸ صفحات کے کینوس میں سمیٹا ہے۔ اس طویل بوقلمون منظر نامے میں ۱۹۴۷ء کا کامونکی ریلوے اسٹیشن، وہاں ریل گاڑی سے اٹھنے والی لاشوں کی سزاند، شاہ عالمی کی بربادی، انارکلی، چوک چکلہ، لال حویلی کی کھڑکیاں اور ان کے روشن دانوں سے اندر آتی ہوئی روشنی، فضا میں پھیلی سخت بدامنی، ناریل والا، اور ظہیر الدین بابر کا وہ گھر جو مرجع خلائق اور نوجوان فوجی افسروں کی آماجگاہ تھاسب کچھ متحرک دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح گھنے درختوں میں بھاگتا ہوا ایک بربنہ شخص، میز پر بیٹھنے سے خوفزدہ کردار، مینار پاکستان کا بجوم اور عوامی لیڈر، الفاظ پر مبنی اس تاریخ کا حصہ ہیں۔ کہانی کا رخ جب سوات کی طرف مڑتا ہے تو وہاں کا سلیٹی منظر، آلوچے کے سفید شگوفے اور مینگورہ جانے والی سڑک پر بنا سائیڈ وے ہوٹل سامنے آتے ہیں اور پھر وادی میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ناول میں عصری تاریخ کے تانے بانے بنتے ہوئے ۱۹۹۲ء میں بھارت کے اندر شیو سینا کے مہم جو ممبران، سنی اور سنجے کا اس جنونی جتھے میں شامل ہونا، ماتھے پر تلک لگانا، بابر کی مسجد کو ڈھانے کے لیے اپنی ہارڈ ویئر (اوزار) اٹھانا، اور اس ہولناک واقعے پر اپنی ماں فاطمہ سے اشیرباد لینا جیسے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ الغرض اس تمام عرصے میں ہمارے ارد گرد کی دنیا اور لا تعلق کا یہ منظر نامہ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۹۲ء تک کے چیدہ چیدہ تاریخی و سیاسی واقعات پر محیط ہے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس یوں لکھا گیا ہے۔

"اس نے خفیہ اشارے سے اس ویٹر کو بلایا جو اس سے پیشتر بھی معاون ثابت ہو چکی تھی اور جسے وہ اوبلا نچ کر چکا تھا اور ان اگلی خواتین کے بل کی ادائیگی کر دی اور جو نہی ان خواتین نے یہ جانا کہ سامنے بیٹھے جادو بھرے ڈارک مشرفیوں نے ان کی کافی اور فرنچ فرائز کی پے منٹ کر دی ہے تو انہوں نے بظاہر از حد شرمندگی سے مسکرا کر اپنے تشکر کا اظہار کیا اور یہی وہ سنہری لمحہ تھا جب کو کی اپنی نشست سے اٹھا اور ان دونوں کے سامنے جھک کر اپنے بڑے دانتوں والی باچھوں تک آنے والی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں ٹیبل پر مدعو کیا اور انہیں ہے ہے آنے کے لئے کچے دھاگے کی بھی ضرورت نہ تھی"

"لمبی والی تمہاری ہے اور چھوٹی اور قدرے پلی ہوئی میری ہے۔"

ان کے بیٹھتے بیٹھتے کو کی نے اسے وارن کر دیا۔ "۵۔"

ایک اور جگہ یوں لکھا گیا ہے۔

"آپاچی جب بہت غصے میں آتیں تو مشاہد کو چوڑا ہوا اور پناہ گیر کے القابات سے نواز میں اور اباجی اول تو "ٹھنڈے مزاج میں ہی رہتے اور اگر مجبوراً انہیں ناراض ہونا پڑتا تو وہ گھور کے کہتے "او تیر ابھلا ہو جائے"

--- وہ اس سے آگے نہیں جاسکتے تھے۔ ۶۔

اس طرح اس میں عصری حوالے سے یوں خامہ فراسائی کی گئی ہے۔

"یہ پتہ ہے کس طرح پتہ کرتے ہیں کہ یہ ہندو یا بے مسلمان؟

"کس طرح؟

"اس کی پہلو دیکھ کر۔"

"نہیں یار۔۔۔ مشاہد شرما گیا۔"

ہاں بھائی ہماری پہلو کٹی ہوتی ہے اور ان کی ویسے کی ویسی ہوتی ہے۔ بے شک چیک کر لو مشاہد کو

چیک کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ آگاہ تھا۔ ۷۔

اس طرح کا انداز بیباں مستنصر حسین تارڑ کا ہی ہو سکتا ہے۔ ایک اور مثال دیکھیں۔

آپا جی دو پسر کی روٹیاں پکار رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ مشاہد کا ارادہ اگر پاکستان واپس آنے کا نہیں تو اللہ تعالیٰ "

اسے خوش رکھے۔ میری دعائیں شامل حال رہیں گی۔ باجیاں بھی سلام کہتی ہیں --- ۸۔

--- اور یہ انداز بیان کتنا دلکش ہے۔

"بند ڈھلیے پڑتے جارہے تھے۔ ربط کی رسی میں تناؤ کم ہو رہا تھا --- یہ سب کچھ بے وجہ اور بے سبب ہو رہا تھا۔ اولاد کا نہ ہونا کوئی جواز نہ تھا۔ کچھ اور تھا جو محبت کے ربط کو کمزور کر رہا تھا۔۔۔ شاید محبت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جس کے پار جاتے ہیں اس کی گرفت کم ہو جاتی ہے اور یہ حد کہاں سے شروع ہوتی ہے۔۔۔۔ پہلی داڑھ کے سفید چین میں گرنے سے۔۔۔

آنکھوں کے گرد پہلی جھریوں سے یا بدن سے مکمل آشنائی کے بعد اس کی یکسانیت سے۔۔۔ "۹۔ مستنصر حسین تارڑ کو افسانوی نثر لکھنے کا اصل ڈھنگ آتا ہے، انہوں نے انسانی نفسیات اور معاشرے کی کئی پیچیدہ کیفیات کو ناول میں خاصے ٹھوس اور جاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ تارڑ نے اس ناول میں صرف فکری ہی نہیں، بلکہ لسانی اعتبار سے بھی گہرے شعور اور ندرتِ بیان کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے انگریزی اور اردو زبان کو ایک ہی سطح پر رکھ کر برتنے کا خوبصورت انداز اپنایا ہے جہاں کہانی اور کرداروں کے لحاظ سے جہاں ضروری تھا وہاں انہوں نے میں لکھے ہیں، اور لسانی تنوع کا یہی اچھوتا استعمال ان (Transliteration) انگریزی کے مکالمے بھی اردو رسم الخط کے اسلوبِ بیان کی کامیابی کا ایک بڑا راز ہے پنجابی زبان بھی بعض اوقات موقع محل کے مطابق استعمال کی ہے چند مثالیں دیکھیں۔

"کمال نے سر جھٹک کر اور اپنے ہاتھ کو گھما کر شہادت کی انگلی کا رخ مشاہد کی طرف کر دیا وزر۔ آئی گوٹ "ہو ---

تو یو ڈڈ ناٹ آئی گاٹ ہو۔ مشاہد کو یقین تھا کہ اس پستولی مقابلے میں وہ جیا ہے "۔ ۱۰ "لیکن وہ بویہاں بھی موجود تھی۔ اس ہلکی میں جو چناب سے آرہی تھی۔ اس کے بانوں میں بھی موجود تھی --- عشقے دا اک پلنک نوآڑی --- وے اسان چانینیاں وچ ڈانیا ---" ۱۱

"رات چنیں دی چانتی تے پونی ورگاں کاں "۔۔۔ میان محمد نے وہ کیسی چاننی دیکھی جس میں ایک کوا داخل ہوا تو کپاس کی پونی کی طرح سفید ہو گیا۔" ۱۲

: ناول میں ارسل نامی لڑکی مشاہد سے ملتی ہے ان کے درمیان ہونے والی بات چیت ملاحظہ ہو

"یہ سیاستدانوں کی باتیں ہیں۔ مشیل ہمارا ان سے کیا تعلق --- تمہیں پتہ ہے ناں میں تم سے محبت کرتی ہوں اگر "چہ تم اکیس برس کے نہیں ہو۔۔۔۔۔ او۔اب چلتے ہیں۔۔۔

"بی جنٹل۔۔۔۔

"ہو کیئرز۔۔۔۔۔ زیرو پلس زیرو۔۔۔۔۔ از۔۔۔۔۔ برابر ہے زیرو۔۔۔۔۔ یہ کیسا بیان ہے۔۔۔۔۔ میں کثیر تو نہیں کرتا لیکن۔۔۔۔۔

"تم نے ایک مدت سے ناخن نہیں کاٹے۔۔۔۔۔"

"ہو کیئرز " ۱۳

قصہ یا کہانی کو دلچسپ بنانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، یہ ایک ایسی خدا داد نعمت ہے جو بہت کم لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔ کسی بھی کہانی کی بنیادی خوبی ہی یہ ہوتی ہے کہ قاری اسے پڑھتے ہوئے ہر دم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے پھر کیا ہوا؟" یا تجسس کے اسی عالم میں آگے بڑھتا چلا جائے۔ ناول دراصل زندگی کا ایک گہرا تجربہ پیش کرتا ہے "کہ اور یہی تجربہ ناول کا اصل مواد ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول میں جو زندگی پیش کی ہے اس میں مصنف کی اپنی شخصیت، ذاتی مشاہدات، اور آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں ہو بہو وہی زبان استعمال کی ہے جو اس مخصوص ماحول اور معاشرتی پس منظر میں بالکل فٹ بیٹھتی ہے۔ تارڑ نے اپنے گہرے مشاہدے کی بنیاد پر زندگی کے بارے میں چند اہم رائیں بھی قائم کی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے زندگی کے ہر ہر پہلو کی تصویر تو نہیں کھینچی لیکن جس پہلو کو بھی چننا، اس میں سچائی اور حقیقت کے حقیقی رنگ بکھیر دیے ہیں۔ انہوں نے ناول میں زندگی کو ایک نئے سرے سے تخلیق کیا ہے۔ جو اگرچہ ہو بہو حقیقی زندگی تو نہیں لیکن حقیقی زندگی ہی کی طرح متحرک دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کے کردار عام گوشت پوست کے افراد سے اس معنی میں مختلف اور منفرد نظر آتے ہیں کہ وہ اپنے جذباتی اور فکری ارتقا میں ہر طرح سے مکمل اور جاندار ہوتے ہیں۔ "راکہ " میں مصنف نے ناول کے پلاٹ کے مختصر اجزاء کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا ہے۔ پلاٹ مکمل موثر اور دلکش ہے اس میں کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ اس میں تغیر و تعجب کی کیفیت زیادہ سے زیادہ ہے۔ پلاٹ کے مختلف مراحل میں اس کے بعد کیا ہوا اس کے بعد کیا ہوا قاری کو ناول چھوڑنے سے روکتا ہے اور وہ آگے ہی آگے صفحے پڑھتا اور پلٹتا جاتا ہے۔ اگر راکہ کو مندرجہ بالا الفاظ پر پرکھا جائے تو اس کی کہانی تازہ ہے ، دلچسپ ہے ، واقعات میں ربط ہے۔ ناول نگار نے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔ ہر ماحول کے کردار اپنی زبان کے ساتھ انصاف

کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

الغرض مستنصر حسین تارڑ نے "راکھ" میں جس طرز نگارش کو اپنایا ہے اس میں عملی زندگی کے تجربات ہوں یا معاشرتی نکتہ چینی، انہوں نے ہر بات کو عین فطری انداز میں پیش کیا ہے اور بو بہو وہی الفاظ استعمال کیے ہیں جو عموماً ایسے موقعوں پر بولے جاتے ہیں۔ مصنف کی اسی اعتدال پسندی اور اعلیٰ فنی شعور نے ان کے اسلوب بیان کو حد درجہ جاندار، پرتائیر اور لائق تحسین بنا دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فوزیہ چوہدری، راکھ کی کرید، مضمولہ ماہنامہ تخلیق، لاہور، جلد ۲۸، دسمبر ۱۹۹۷ء، ص ۹۹

۲۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۹

۳۔ فوزیہ چوہدری، راکھ کی کرید، ص ۱۰۰

۴۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۲۲

۵۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۲۲۶

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۷۔ ایضاً، ص ۱۰۰، ۱۰۱

۸۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۹۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، ص ۴۵۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۷۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۹